گردشِ رنگِ چمن: ماضی کی بازیافت یا ماضی پرستی؟

تعارف

(خالد اشرف)

اُردو فکشن کی تاریخ قرۃ العین حیدر کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ موصوفہ نے ناول، افسانہ، رپورتاژ، سفرنامہ، صحافت میں غیر معمولی حد تک اپنی فنّی اور تخلیقی بصیرت کا اظہار نہایت ہی فکری عمدگی اور جمالیاتی پختگی کے ساتھ کیا ہے۔ انہوں نے کم نصف صدی تک اُردو فکشن پر حکمرانی کی۔ تقسیمِ ہند، فسادات اور ہجرت کے موضوع پر ان کا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' ادبی اُفق پر اُن کی شاندار آمد پر دال ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے عینی نے اودھ کے جاگیردارانہ معاشرے سے وابستہ یادوں کو اپنے تخلیقی فن پاروں میں جگہ دی ہے بلکہ ان پر یہ بھی اعتراض کیا جارہا ہے کہ اُن کے ادب میں متوسط اور نچلے طبقے کے کرداروں کا گزر ممکن نہیں اور نہ ہی یہ طبقات اُن کی توجہ کے مستحق قرار پائے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ عینی کے یہاں ماضی پرستی اس حد تک غالب آگئی ہے کہ اُن کا ہر فن پارہ ناسٹلجیائی عناصر سے بھرپور ہے۔ ڈاکٹر خالد اشرف نے اس مقالے میں ''گردشِ رنگِ چمن'' کے تحت قرۃ العین حیدر کی ناسٹلجیائی ذہنیت کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے قرۃ العین حیدر کے بورژروا طبقے سے ہمدردی کو مثالوں سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ مقالہ فکشن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بالعموم اور عینی کے فکر وفن سے تعلق رکھنے والوں کے لیے بالخصوص اہمیت کا حامل ہے۔ مقالہ نگار نے قرۃ العین حیدر کے متون کے برمحل حوالے دے کر اپنی بات کو موثر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ادارہ ترسیل کو یہ معلوماتی مقالہ قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے مسرت ہورہی ہے۔

اہم لفظیات: تقسیمِ برصغیر، فکشن، متوسط طبقہ، طبقہ اشرافیہ، سوانحی ناول ، رپورتاژ، اودھی تہذیب، آفاقیت، مغرب پرستی، فرقہ واریت، فسادات، تصوف۔

قرۃ العین حیدر کا ذکر آتے ہی ہم اُردو والوں کے سر عقیدت اور مرعوبیت سے خم ہو جاتے ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیئے کیوں کہ وہ پریم چند کے بعد اُردو فکشن کا دوسرا اہم ترین نام ہیں۔ یہاں سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ پریم چند کے بعد کیوں، اُن کے ہم پلّہ کیوں نہیں؟

راقم کے خیال میں پریم چند کو اوّلیت کا مقام دینے کی وجہ اُن کا دائرۂ فکر World view ہے جس کے مقابلے میں قرۃ العین حیدر پس ماندہ رہ جاتی ہیں۔ پہلی بات پریم چند کے فکشن کے تعلق سے یہ ہے کہ اُن کے ناولوں اور افسانوں کا کینوس زیادہ وسیع تھا کیوں کہ ان کے یہاں ہندو، مسلمان، کسان، مزدور اور گاندھی، نہرو کے عہد کا شہری مڈل کلاس سبھی نظر آتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر خود کو زیادہ تر اودھ کے جاگیرداروں اور ان کی انگریزی تعلیم یافتہ اولادوں تک ہی محدود رکھتی ہیں۔ دوسرا سوال 'آگ کا دریا' (۱۹۵۹) اور پاکستان ہے۔ وہ برضا و رغبت ایم۔اے انگریزی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد شاید ۱۹۴۹ء میں کراچی گئیں، وہاں بارہ تیرہ سال سرکاری و غیر سرکاری اداروں سے وابستہ رہیں۔ سرکاری حلقوں سے قدرت اللہ شہاب اور جمیل الدین عالی کے ذریعے روابط قائم رکھے، لیکن جب 'آگ کا دریا' کی اشاعت کے بعد ناول پر اور مصنفہ کی ذات و شخصیت پر پست قسم کے حملے ہونے لگے تو وہ (شاید) ۱۹۶۰ء میں خاموشی سے براستہ لندن ہندوستان چلی آئیں۔ پاکستان میں ایوب خان کے مارشل لاء کے بعد ''آگ کا دریا'' کو سنسر کیا گیا اور اس کا ایک مکمل صفحہ اور شاید ۲۰ سے ۳۰ سطور حذف کر دی گئیں، تاہم قرت العین حیدر اس مسئلہ پر بھی تمام عمر خاموش رہیں۔ آج بھی ''آگ کا دریا'' کے محذوف شدہ متن کے بارے میں ہم کو کچھ علم نہیں کہ وہ مواد کیا تھا اور کہاں گیا؟ جب کہ پریم چند اپنے سامراج دشمن خیالات کا عملی اظہار کرتے ہیں۔

وہ (عینی) خواجہ احمد عباس کی مدد سے نہرو حکومت سے شہریت حاصل کر کے شاید سب سے پہلے بمبئی آباد ہوئیں اور (شاید) ۱۹۶۰ء کے بعد آٹھ نو برس انگریزی رسالے "Imprint" کی منیجنگ ایڈیٹر اور پھر ایڈیٹر رہیں۔ دراصل یہ رسالہ امریکی بدنام ایجنسی C.I.A کی سوویت یونین مخالف مہم کا حصہ تھا۔ اس رسالے کے اولین مدیر

Philip Knightley نے اپنی کتاب "A Hack's Progress" میں اعتراف کیا ہے کہ خود اس کو بہت بعد میں علم ہوا کہ وہ C.I.A. کا ملازم رہا تھا۔ 'Imprint' میں امریکی کلچر اور ادب کی تعریف و تحسین میں مضمون شائع کیے جاتے تھے اور امریکہ کی مشہور کتابوں کے مختصر شدہ نسخے ایک روپیہ فی کاپی کے حساب سے فروخت کیے جاتے رہے۔ یہ رسالہ ۱۹۸۶ء میں بند ہوا۔ 'Imprint' پر ایک مفصل مضمون دہلی کے مشہور انگریزی رسالے 'Outlook' کے شمارہ بابت ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۵ء میں شائع ہو چکا ہے، پھر بھی قرۃ العین حیدر Imprint کی ملازمت کے بارے میں خاموش رہیں۔ پھر وہ ٹائمس آف انڈیا گروپ کے رسالے 'Illustrated Weekly of India' میں مدیر خوشونت سنگھ کی ٹیم میں چند برس کام کرتی رہیں۔ اس پر بھی انھوں نے کبھی نہ کچھ بتایا نہ ہی لکھا۔ 'Imprint' سے بھی اہم C.I.A. کا انگریزی رسالہ 'Encounter' لندن سے ۱۹۵۳ء سے ۱۹۹۱ء تک شائع ہوتا رہا تھا۔ یہی فریضہ گوپال متل کا سوویت یونین مخالف رسالہ ''تحریک'' ادا کرتا رہا تھا، اور کچھ اسی قبیل کی مشکوک نوعیت کا ادارہ لندن میں قائم افتخار عارف کا اردو مرکز اور دہلی میں قائم قرۃ العین حیدر کا Third World Foundation تھا۔ ان دونوں کلچرل اداروں کے لیے سرمایہ آغا حسین عابدی کا بدنام بنک BCCI کرتا تھا جو تجارتی و مالی گھپلوں کی بنا پر بالآخر بند ہوا۔

یہ بات صاف ہے کہ قرۃ العین حیدر کی ہمدردیاں ان طبقوں کے ساتھ بالکل نہیں تھیں جن کی نمائندگی اور حمایت پریم چند کرتے تھے۔ اس کے علاوہ پریم چند کے فکر و فن کی ایک قوت ان کے مضامین میں بھی ہے جن وہ ایک سیکولر اور انسان دوست ادیب کے طور پر سامنے آتے ہیں جب کہ قرۃ العین حیدر کے مضامین یا سوانحی ناول ان کو صرف اعلیٰ طبقے (Upper Class) تک محدود رکھتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کی فکر کا ایک اہم عنصر ان کے انٹرویو ہیں جن میں سے تقریباً ڈیڑھ درجن انٹرویوز کو انھوں نے ۲۰۰۱ء میں ''نوائے سروش'' جیسے غلو آمیز عنوان کے تحت کتابی شکل میں شائع کرا دیا تھا۔ ان انٹرویوز میں سب سے اذیت ناک اور طویل انٹرویو جمیل اختر نے لیا۔ باقی آغا سہیل، آصف فرخی، سہیل احمد خان، شفیع عقیل، افتخار امام صدیقی، ابوالکلام قاسمی، شمیم حنفی، زبیر رضوی، حسن رضوی اور شہزاد منظر صاحبان نے لیے تھے۔ ان انٹرویوز میں لہجے کی درشتگی اور طعن و تشنیع اکثر گراں گزرتے ہیں۔ کچھ مثالیں مندرجہ ہیں:

۱۔ ''یہ بالکل بکواس ہے، غلط ہے، کہاں خفا ہوئی، کس پر خفا ہوئی، کس کو میں نے جھاڑا''؟[۱]

۲۔ ''شوکت صدیقی بیوقوفی کی باتیں کرتے ہیں''۔[۲]

۳۔ ''شروع کرتے ہیں تو عصمت چغتائی سے یا رشید جہاں سے۔اس سے پہلے حجاب امتیاز علی کو مذاق کے طور پر، ہمارے یہاں جو فکشن کے بارے میں لکھا گیا، وہ جاہلانہ ہے''۔[۳]

۴۔ ''فیوڈلزم کی طرف دار کب تھی میں، یہ سوال آپ کا نہایت بے وقوفانہ اور جاہلانہ ہے۔کیا ثبوت ہے آپ کے پاس کہ میں فیوڈلزم کی طرف دار ہوں۔کہاں ہے ثبوت؟''[۴]

۵۔ یہ جو جدیدیئے ہیں ان لوگوں کا کوئی ایک بھی رائٹر سروائیو Survive نہیں کر سکا، سوائے چند ایک کے جن کے یہاں تھوڑی سے جھلک پرانے بیانیہ کی تھی۔ورنہ ایک زمانہ وہ تھا کہ چھت سے اُڑی چھپکلی، بندر کی چونچ میں مرغا اور مرغے کی چونچ میں سورج۔اس قسم کی مہمل چیزیں ایک زمانے میں بہت آ رہی تھیں''۔[۵]

۶۔ ''مابعد جدیدیت کیا ہے؟ مجھے نہیں معلوم۔میرے پاس اس طرح کی فالتو باتوں کے لیے وقت نہیں ہے''۔[۶]

۷۔ ''ہمارے ہاں فکشن کی تنقید ہی نہیں۔ابھی ہمارے ہاں فکشن کو پڑھا نہیں گیا۔آپ لوگ بس شاعری کو سمجھ لیتے ہیں کیونکہ یہ اُردو میں بہت پہلے سے موجود ہے''۔[۷]

۸۔ I would not like to use this word لیکن ایک تنقید کی مافیا ہے۔اس مافیا کو آپ توڑ نہیں سکتے''۔[۸]

۹۔ میرے ناقدین کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ جو کچھ میں کہنے کی کوشش کر رہی ہوتی ہوں وہ اس کی گہرائی تک پہنچنے کی کوششیں نہیں کرتے''۔[۹]

۱۰۔ ''فسادات برابر ہو رہے ہیں لوگ اس بارے میں لکھتے ہی نہیں۔اتنے بے حس ہو گئے ہیں کہ لکھتے ہی نہیں ہیں۔لیکن میں لکھ رہی ہوں عنوان تھا ''قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے''۔[۱۰]

ان بیانات سے جو تصویر قرۃ العین حیدر کی ابھرتی ہے وہ مثبت نہیں ہے کیوں کہ جو عزت و احترام، انعامات و اکرام ان کو ملے اُردو میں شاید ہی کسی دوسرے ادیب کو ملے ہوں۔اُردو کے تقریباً ہر ایک چھوڑے بڑے نقاد نے ان

پر لکھا، ان پر دانش گاہوں میں مقالے لکھے گئے لیکن رسائل کے خصوصی نمبر کم نکلے کیوں کہ وہ رسائل کے مدیروں کو ہمیشہ فاصلے پر رکھتی تھیں اور مزاجاً کم آمیز تھیں۔ ان کو ہندوستان کا سب سے اہم ادبی اعزاز گیان پیٹھ حاصل ہوا اور ایک نہیں دو۔ دو یونیورسٹیوں میں بطور مہمان پروفیسر تدریس کا شرف ملا۔

جب ۱۹۴۹ء میں قرۃ العین کا پہلا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' شائع ہوا، ترقی پسند افسانہ نگاروں بالخصوص کرشن چندر، عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی اور راجندر سنگھ بیدی کی شہرت و اہمیت کا سورج نصف النہار پر تھا۔ کرشن چندر اس گروپ کے سب سے زیادہ پاپولر اور Highest paid مصنف تھے اور قرۃ العین حیدر ہی کی طرح انگریزی میں ایم۔ اے۔ لیکن انگریزی اور انگریزوں سے کچھ سیاسی قسم کی رنجش رکھتے تھے۔ اسی لیے 'میرے بھی صنم خانے' پڑھ کر انھوں نے بڑی جچی تلی رائے دی تھی کہ اس ناول میں پارٹیوں کے تذکرے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ پھر ۱۹۵۰ء میں اسی ناول کا Re-flash 'سفینۂ غمِ دل' کی شکل میں شائع ہوا تو بھی قرۃ العین حیدر کا زیادہ نوٹس نہیں لیا گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۳ یا ۲۴ برس تھی۔ یہ دونوں ناول اودھ کے رئیس زادوں کی Family SAGA اور تقسیمِ ہند کے صدموں کی شاعرانہ روداد سے زیادہ اہمیت حاصل نہ کر سکے۔ اصل ہنگامہ اور بحیثیت قرۃ العین حیدر کے تیسرے ناول 'آگ کا دریا' (1959) پر ہوئی جس میں اودھ کی مشترکہ تہذیب کے خاتمے اور وہاں کے جاگیردار طبقے کے معاشی و تہذیبی بے چارگی کو وجودی سطح پر دکھایا گیا تھا۔ مصنفہ کے ''سوانحی ناول Non-Fictional Novel '' کارِ جہاں دراز ہے'' (۱۹۷۷ تا ۱۹۷۹ء) کا دائرہ وسیع تھا لیکن یہ ایک بڑے خاندان کی بڑی مرصع سوانح ہی رہی، ناول کی کوئی رمق اس میں نہیں تھی۔ اس روشن خیال قبیلے کی یہ سوانح تیسری جلد بعنوانِ ''شاہراہِ حریر'' (۲۰۰۸ء) پر ختم ہوئی۔ قرۃ العین حیدر کی دیگر تحریروں کی طرح ان تین جلدوں کی زبان بھی بڑی خوبصورت اور شاعرانہ تھی لیکن ان کا احساسِ تفاخر مولانا ابوالکلام آزاد کی انانیت سے بھی شاید کچھ زیادہ ہی بلند نکلا۔

''آخرِ شب کے ہم سفر'' (۱۹۷۹ء) بھارت چھوڑو کی عظیم الشان تحریک کے رومانس سے شروع ہو کر قیامِ بنگلہ دیش کے Disillusionment پر ختم ہوتا ہے۔ ناول کے آخری حصے میں وہ بنگال کی آرٹسٹ ثقافت کو نہ تو مہارت کے ساتھ پیش کر سکیں اور نہ ہی بنگال کی دہشت پسند تحریک کی جڑوں تک پہنچ سکیں۔

چاندنی بیگم (۱۹۸۹ء) قرۃ العین حیدر کا آخری ناول تھا جس میں نئے ہندوستان میں فرقہ واریت

اور رشوت کے فروغ کے ساتھ ساتھ ادنیٰ و کمتر سمجھے جانے والی پسماندہ ذاتوں کے تازہ Political Assertion کو موضوع بنایا گیا تھا۔ بقولِ مصنفہ زمین اور اس کی ملکیت اس پہلودار ناول کا بنیادی استعارہ ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ایمرجنسی کے بعد کے متشدد اور بدعنوان ہندوستانی معاشرے کی کلی تفہیم نہ ہونے کی بنا پر قرۃ العین کا یہ آخری ناول بھی ان کے پہلے ناول کی طرح کمزور ثابت ہوا۔

قرۃ العین حیدر کے تعلق سے ہم اُردو والے بخوبی جانتے ہیں کہ اودھ کی نوابی ثقافت اور کمپنی کے زیر اثر وجود میں آئی نئی اینگلو انڈین تہذیب کی افہام و تفہیم پر جیسی گرفت قرۃ العین حیدر کو تھی تمام ہندوستان و پاکستان میں شاید کسی اور دانشور یا ادیب کو نہیں تھی۔ شاید اسی لیے شمس الرحمان فاروقی نے اپنے تہذیبی مطالعے 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' (۲۰۰۶ء) کے لیے دلی کی مغل سرِ زمین کو منتخب کیا اور اودھ کی طرف نہیں گئے، جو اُن کا بھی وطن ہے۔

میرے خیال میں 'گردشِ رنگ چمن' نہ تو عندلیب بیگ کی کم نصیبی کا بیان ہے اور نہ ہی ڈاکٹر عنبرین کی محروم اور تشنہ آرزوؤں کا آئینہ۔ یہ ناول دراصل اودھ کی رئیسانہ تہذیب کی نفاست اور نزاکت کے زوال کا رزمیہ ہے۔ قرۃ العین حیدر آگاہ کرتی ہیں کہ وہ نہایت تحقیق اور تلاش کے بعد ہی کوئی تحریر سپردِ قلم کرتی ہیں اور ان کا یہ دعویٰ سرتا سر درست بھی ہے کیوں کہ تاریخ کے چند گوشوں، فنِ موسیقی اور فنِ تعمیر پر ان کی معلومات ان کی تحریروں میں خود کو منوا بھی لیتی ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ان کی ریسرچ پر معروضیت (Objectivity) کے بجائے اودھ سے ان کا جذباتی لگاؤ غالب آ جاتا ہے۔ ان کی Magnum opus 'آگ کا دریا' کا ایک کردار جب کہتا ہے کہ:

''یہ لکھنؤ کی مٹی ہے۔ اسے تم اپنے ساتھ لے جاؤ۔ کیوں کہ اس شہر کا یہ جادو ہے کہ یہ چھوٹ جائے تو بے طرح یاد آتا ہے''۔[۱۱]

تو ذہین قاری سمجھ جاتا ہے کہ یہ قرۃ العین حیدر کے دل کی آواز ہے اور اس آواز کا سلسلہ ۱۸۵۶ء کے الحاقِ اودھ کے سانحے سے جا کر ملتا ہے۔ جب بے کس و لاچار اختر پیا مٹیا برُج سدھارے تھے۔ قرۃ العین حیدر مسعود حسن رضوی کی طرح واجد علی شاہ کے بارے میں بڑی جذباتی ہو کر لکھتی ہیں:

> ''آخری مغل بادشاہ اور اودھ کے فرمانروا اگر عیش پرست، ظالم اور لغو تھے، محمد شاہ رنگیلے اور واجد علی شاہ صرف ناچا گایا کرتے تھے تو سارے ہندوستان میں دولت اور تجارت کی یہ فراوانی کیسے

رہی؟ سلطانِ عالم جب مٹیا بُرج لے جائے گئے ہیں تو اودھ کا بچہ بچہ اشکبار تھا۔ بھلا کوئی جابر اور نکمّے بادشاہوں کے لیے روتا ہے؟''۱۲؎

قرۃ العین حیدر، واجد علی شاہ جیسے عیش پرستوں کے تہذیبی کردار پر تو زور دیتی ہیں لیکن ان کی پست اخلاقیات کو نظر انداز کر جاتی ہیں۔خود واجد علی شاہ اپنی confession نما کتاب ''پری خانہ'' (تقریباً ۱۸۵۰ء زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی) میں مطلع کرتے ہیں کہ ان کو سوزاک جیسی غلیظ بیماری لگ گئی تھی جس کی بنا پر ان کی طوائف پریاں ان کو نظر انداز کرنے لگی تھیں۔ان کا ذاتی و قومی وقار تو اس قدر مُردہ ہو چکا تھا کہ ان کی تخت نشینی کے پہلے ہی سال یعنی ۱۸۴۷ء میں گورنر جنرل لارڈ یارڈنگ لکھنؤ آیا تو واجد علی شاہ اس کا استقبال کرنے کے لیے کان پور تک گئے۔'پری خانہ' کے مترجم تحسین سروری کتاب کا خلاصہ ان الفاظ میں درج کرتے ہیں:

''یہ ایک جنسی مریض کی داستانِ ہجر و وصال ہے جو بادشاہ ہونے کے باوجود حالات وخواہشات کا غلام اور ایک مجبور و بے بس انسان ہے۔ یہ ہرگز محسوس نہیں ہوتا کہ ہم ایک تخت و تاج کے مالک کی تحریر پڑھ رہے ہیں۔اس لحاظ سے واجد علی شاہ اختر کی یہ تصنیف بڑی اہم ہے''۔۱۳؎

عہد وسطیٰ کی فیوڈل شخصیات کی تعریف و تحسین نے 'گردشِ رنگِ چمن' کو اس قدر لبریز کر دیا ہے کہ اوسط ذہنو ں کے قاری کو یہ سوچنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا ہے کہ جب اودھ کی نوابی تہذیب اس درجہ سیکولر اور انسان دوست تھی کہ رعایا واجد علی شاہ کو یاد کر کے آنسو بہاتی تھی تو ۱۸۵۶ء میں کمپنی کے ناجائز قبضے کا مقابلہ کجا، اس کے خلاف احتجاج تک کیوں نہیں ہوا؟

قرۃ العین حیدر نوابی عمارات کی تعمیر، نوابین کی شاعر مزاجی اور ان کے متوسلین و مصاحبین کی نفاست میں اس قدر محو ہو جاتی ہیں کہ ان کو لکھنؤ شہر کے اطراف کی غریبی، بھکمری اور بے وقعتی غیر اہم یا نا قابلِ ذکر محسوس ہوتی ہیں۔ یہاں پر سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ مصنفہ کی تربیت دہرہ دون، علی گڈھ اور لکھنؤ کے نیم جاگیر داری اور نیم انگریزی ماحول میں ہوئی تھی، کیا ان سے اودھ کے گاؤں میں جاگیر دارانہ جبر کے شکار کسان، مزدوروں اور ان دستکاروں وصناعوں کی کسمپرسی کو تحریر کرنے کا مطالبہ نامناسب اور غیر شریفانہ ہے؟ قرۃ العین حیدر نے کسی انٹرویو میں کہا بھی تھا کہ وہ اپنے انگریزی داں طبقے کی ہی عکاسی کر سکتی ہیں، جس کا انھوں نے بچپن سے مشاہدہ اور تجربہ کیا ہے لیکن بات یہاں پر ختم

نہیں ہو جاتی۔ اس لیے کہ عام فنکار اور بڑے فنکار کے درمیان فرق ہی یہ ہے کہ بڑا فنکار اپنے مذہب اور کلاس اور اپنی علاقائیت کی سرحدوں کو توڑ کر آفاقیت (Universality) کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ پریم چند کسان نہیں تھے لیکن انھوں نے De-Class ہو کر کسانوں اور دلتوں کے بارے میں شاہکار فن پارے تخلیق کیے۔

قرۃ العین حیدر بیسویں صدی کے اواخر کے ہندوستان میں فروغ پا رہی ہندو فرقہ پرستی سے بجا طور پر پریشان تھیں اور اسی پریشانی کے اظہار کے طور پر انھوں نے ایک ’عالمِ آشوب‘ بعنوان ’’قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے‘‘ قلمبند کیا تھا۔ حالاں کہ اُردو ناول اور افسانوں میں فرقہ پرستی ایسا موضوع ہے جس پر ۱۹۹۰ء کے بعد سے لگاتار لکھا جا رہا ہے لیکن قرۃ العین حیدر شہزاد منظر کو دیے گئے انٹرویو میں اُردو والوں کو ’بے حس‘ قرار دیتی ہیں کیوں کہ ان کو غلط فہمی تھی کہ فرقہ واریت پر بالکل نہیں لکھا جا رہا ہے۔ چلئے یہ تو ان کی بے خبری رہی، لیکن ان کی خوش فہمی بھی عجیب ہے کہ وہ سمجھتی ہیں کہ مزاروں، درگاہوں اور تعزیوں کے جلوس میں غیر مسلم افراد کی شرکت سیکولرازم کو مستحکم کرے گی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ:

> ’’یہ تعزیوں، پیروں، فقیروں اور درگاہوں اور رام لیلاؤں کی کلچر ہماری اصل کلچر ہے اور بڑی نعمت ہے کہ اسے ہرگز ہرگز مٹنے نہیں دینا چاہئے۔ نہ یہ بدعت ہے نہ اوہام پرستی، نہ شرک نہ بت پرستی، یہ محض ہمارے عوام کا تہذیبی سرمایہ ہے‘‘۔[۱۴]

پروفیسر شہریار کو ۱۹۸۷ء میں دیے گئے ایک انٹرویو میں قرۃ العین نے کہا تھا کہ وہ تصوف میں بہت دلچسپی رکھتی ہیں اور تصوف پر وہ کچھ تحقیقی کام کر رہی ہیں اسی زمانے میں ’گردشِ رنگِ چمن‘ شائع ہوا تھا، جس کے تقریباً دو سو صفحات مجگاواں شریف (ضلع بارہ بنکی، اتر پردیش) کے پیر عارف صاحب کی تعریف و تحسین کے لیے وقف ہیں۔ پیر عارف صاحب اسموکنگ کرتے ہیں، اپنی مرسیڈیز خود ڈرائیو کرتے ہیں اور روایتی پیروں کی طرح اسلامی لباس پہننے کے بجائے جینز اور شرٹ زیب تن کرتے ہیں۔ حد ہے کہ پندرہ بیس کتے بھی پال رکھے ہیں لیکن گاؤں قصبوں کی ہندو مسلم خلقت ہے کہ ماڈرن میاں صاحب کے چاروں طرف اُمڈی چلی آتی ہے۔

چلئے یہاں تک تو غنیمت تھا کہ میاں صاحب ماڈرن قسم کے پیر ہیں کیوں کہ آج کے ہندستان میں ہزاروں نام نہاد بابا اور سنیاسی ایسے ہیں جو ائیر کنڈیشن آشرموں میں رہتے ہیں اور یورپ و امریکہ ہوائی جہازوں سے گھومتے

ہیں بالخصوص ہندوسماج ان جوگیوں بھوگیوں کے طرزِ زندگی پر انگلی نہیں اٹھاتا کیوں کہ آج کے نیم تعلیم یافتہ اور سطحی طور پر ماڈرن نظر آنے والے معاشرے میں بدعقیدگی اوراندھ وشواس کروڑوں روپے کی انڈسٹری بن گئے ہیں۔قرۃ العین حیدر عمر کے اواخر میں پیر عارف میاں کی بڑی بھگت بن گئی تھیں اوران کی پیری کے Glorification کے لیے عجیب وغریب تاویلات Create کرنے لگی تھیں۔'گردشِ رنگِ چمن' میں بیان کنندہ ٹائپ ایک کردار عربی باجی کا ہے جو عربی زبان کی پوسٹ گریجویٹ تھی اور شمالی افریقہ کی کسی یونیورسٹی میں استانی رہ چکی تھی۔ یہ عربی باجی ناول کوغور سے پڑھنے پر قرۃ العین حیدر کا Clone ہی نظر آتی ہے اوراس قسم کے ناقابل یقین بیانات دے کر عارف میاں کے پبلسٹی ڈویژن کی ناظم کا رول ادا کرتی ہے:

''میاں کے والد علیہ الرحمہ بھی صاحبِ وقت تھے، میاں اس دور کے قطب ہیں بلکہ قطب الاقطاب''۔۱۵

''جب مجھے لوگوں نے بتایا کہ وہ میاں کو بیک وقت کئی مسجدوں میں نماز پڑھتے دیکھ چکے ہیں تو میں نے زور کا قہقہہ لگایا۔پہلی بار آئے سرکار بس اسٹاپ تک چھوڑنے۔قصبے تشریف لے گئے۔ کوئی میلہ چل رہا تھا۔ میں اتر کر بمشکل ہجوم سے نکلتی بس میں پہنچی، وہ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ پلٹ کر دیکھا سرکار دور اپنی جیپ میں موجود تھے۔کیا دیکھتی ہوں بس کے اندر کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ مجھے جگہ دلوائی اور خدا حافظ کہہ کر اُتر گئے''۔۱۶

''تم میاں کے متعلق جن شک وشبہات کا اظہار کروگے میاں کسی فاصلے پر ہوں انھیں فوراً معلوم ہوجائے گا''۔۱۷

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 'گردشِ رنگِ چمن' دو کمزور عورتوں کی کہانی ہے یا اودھی کلچر کے ماضی کی بازیافت کی کوشش؟ راقم کا خیال یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر نے عندلیب بانو بیگم کو صرف بیان کنندہ کے طور پر استعمال کیا ہے اور ناول کو ناول کم ثقافتی تاریخ (Cultural History) زیادہ بنادیا ہے حالاں کہ پروفیسر شمیم حنفی کا خیال ہے کہ 'آگ کا دریا' اور 'کارِ جہاں دراز ہے' دونوں کے مقابلے میں 'گردشِ رنگِ چمن' تاریخ کے بوجھ سے زیادہ آزاد ہے لیکن ناول کے نہایت گھنے ۵۹۰ صفحات کا مطالعہ کرکے اندازہ ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر نئی اُردو داں نسل کو اپنی کلچرل

معلومات کا خزانہ جلد از جلد منتقل کرنے کی آرزومند ہیں اور اس جلد بازی کے نتیجہ میں نہ ہی کہانی زیادہ ڈیولپ ہو پاتی ہے اور نہ ہی عہدِ حاضر اور عہدِ سابق کا Continuum قائم ہو پاتا ہے۔ انھوں نے جب یہ ناول شائع کیا، اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی اور یہ منفی احساس شاید اُس وقت ان کے اندر پیدا ہو گیا تھا کہ اگر وہ بسرعت اودھ کی ثقافتی تاریخ کو اگلی نسل تک منتقل نہیں کریں گی تو یہ اس نسل کی محرومی ہوگی۔ وہ اپنے مختصر سے حلقے میں تاریخ کے چند گوشوں اور چند منتخبہ ستیوں کے سوانح کا گہرا مطالعہ ہمیشہ سے کرتی رہی تھیں لیکن تاریخ جو سماج کے مختلف طبقوں کے عہد بہ عہد تغیرات کی معاشی وفکری دستاویز ہوتی ہے کبھی قرۃ العین حیدر کا پسندیدہ مضمون نہیں رہا۔ دراصل وہ اپنے ماضی قریب سے چند واقعات اور چند اشخاص کو Pick & Choose کر کے ان کے ثقافتی پہلوؤں کو کرداروں کی زبان سے ادا کراتی ہیں۔ ان کے سبھی کردار تقریباً یکساں شخصیات کے حامل ہوتے ہیں، سماج کے خوشباش حصے سے تعلق رکھتے ہیں، مزاج اور فکر میں گہرا شعری رچاؤ رکھتے ہیں اور شائستہ طور پر جاگیرداری کے نفیس پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ شائستہ لوگ عمل سے زیادہ فکر Contemplation میں یقین رکھتے ہیں۔ گفتگو کی حد تک انسان دوست ہوتے ہیں لیکن اپنے اپر کلاس اطراف سے باہر جانا پسند نہیں کرتے ہیں اور باطن میں تبدیلی مخالف ہیں۔

'گردشِ رنگِ چمن' کا موضوعاتی واسلوبیاتی سلسلہ 'آگ کا دریا' اور 'کارِ جہاں دراز ہے' سے ملتا ہے لیکن اطلاعات کے بوجھ نے اسے ناول نہیں بننے دیا۔ راقم کے خیال میں ناول میں اگر تاریخی واقعات کا عنصر زیادہ شامل کر دیا جائے تو وہ فکشن نہیں رہتا، ایک بھاری بھرکم بلکہ ادق ادب پارہ بن جاتا ہے۔ یہی 'گردشِ رنگِ چمن' کے ساتھ ہوا کہ یہ تاریخ کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا ہے۔

ناول میں نگار خانم، شہوار خانم کے کردار بھی ہیں۔ اور آندرے رنبال، شیخ عبد الباسط، کنور سیٹھ، منصور کا شغری، نواب بیگم، نورما ڈریک اور نوابن وغیرہ بھی لیکن اس کا اصل اور کلیدی کردار ماضی ہے، جس سے باہر نکلنا قرۃ العین حیدر کو قبول نہیں تھا، اس لیے اگر 'گردشِ رنگِ چمن' کو ماضی پرستی کا آخری نمونہ کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ جمیل اختر (مرتب)، نوائے سروش، جمیل اختر (ناشر)، دہلی، ۲۰۰۱، ص....۹۸

ترسیل

۲۔ ایضاً۔ص:۹۷

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً۔ص:۶۵

۵۔ ایضاً۔ص:۹۵

۶۔ ایضاً۔ ص:۹۶

۷۔ ایضاً۔ ص:۲۶۷

۸۔ ایضاً۔ ص:۳۰۳

۹۔ ایضاً۔ص:۲۷۳

۱۰۔ ایضاً۔ص:۳۸۴

۱۱۔ قرۃ الین حیدر، آگ کا دریا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص۔۳۶۱

۱۲۔ قرۃ العین حیدر، گردشِ رنگِ چمن، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۷، ص۔ ۵۲

۱۳۔ واجد علی شاہ، پری خانہ، کتاب کار پبلکیشنز، رام پور، ۱۹۶۵ء، ص:۱۰

۱۴۔ دیپاچہ، نوائے سروش از قرۃ العین حیدر، مرتب و ناشر جمیل اختر،، دہلی، ۲۰۰۱ء، ص:۱۳

۱۵۔ گردشِ رنگِ چمن، ص:۵۳۳

۱۶۔ گردشِ رنگِ چمن، ص:۵۴۷

۱۷۔ گردشِ رنگِ چمن، ص:۵۴۹

☆☆☆

رابطہ:

ڈاکٹر خالد اشرف

ایسوسیٹ پروفیسر

کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی

ای میل:khaliddu@gmail.com

موبائل:+91 8800489012